(غلام گردش)

## ''بکی ہوئی روحیں''

کنیز کی عمر اس وقت کیا ہوگی۔ پچیس برس یا شائد چوبیس سال۔ اگر ہم یونیورسٹیوں، کالجوں اور تعلیمی درسگاہوں پر نظر ڈالیں تو اس عمر کی لڑکیاں عام نظر آتی ہیں۔ زندگی کی جدوجہد میں مصروف اور مستقبل میں آنے والی زندگی کے خواب۔ ان میں کسی قسم کی کوئی نئی بات نہیں ہوتی۔ بلکہ دیکھا جائے تو کوئی پرانی بات بھی نہیں ہوتی۔ عام سے لوگ، عام سی زندگی، شادی، بچے، پھر لگی بندھی زندگی۔ مگر ہمارے ملک میں یہ عام سی زندگی بھی ہر کسی کو میسر نہیں۔ کنیز کو تو بالکل نہیں۔

صرف اور صرف چودہ برس کی تھی کہ دیہی علاقے کی روایات کے مطابق شادی ہوگئی۔ چودہ سال کی تو ننھی سی بچی ہوتی ہے۔ گڑیوں سے کھیلنے کی عمر۔ گڈا گڈی کی شادی کروانے کی رسومات والی ذہنی سطح۔ مگر غربت نے کنیز کے والد کو اتنا بے بس کر ڈالا کہ معاشرے کی روایات کے مطابق اپنے سر سے بوجھ اُتارنے کی جلدی کی۔ جی ہاں! کہنے کو تو بڑے بڑے مقدس جملے استعمال کیے جاتے ہیں۔ مگر معاشرے کی اکثریت بچیوں کو سماجی بوجھ ہی سمجھتے ہیں اور اس سے سبکدوش ہونے کی جلد از جلد کوشش کی جاتی ہے۔ جہاں تعلیم کم ہو، وہاں شادیاں بہت جلد کر دی جاتی ہیں یا ہو جاتی ہیں۔ کنیز انہی بدقسمت بچیوں میں سے ایک تھی جنکی ہتھیلیوں میں خدا نے خوش بختی کی لکیریں نہیں رکھی۔ باقی سب کچھ یہ منافق معاشرہ دھندلا دیتا ہے۔ جس شخص سے شادی کی گئی اسکی عمر بھی بیس برس کی تھی۔ پیشے کے لحاظ سے مزدور تھا۔ دیہاڑی دار مزدور۔ کبھی دیہاڑی مل گئی تو چار پانچ سو روپے گھر آ گئے۔ چولہا جل پڑا۔ ورنہ مفلس کے گھر فاقوں کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہوتا۔ دو برس میں کنیز کے گھر دو بچے بھی ہو گئے۔ گھر کے حالات مشکل سے مشکل تر ہو گئے۔ خاوند ایک دن مزدوری کر رہا تھا کہ عمارت کی چھت سے پیر پھسلا اور سر کے بل نیچے آ گرا۔ دماغی چوٹ آنے سے فوری طور پر مر گیا۔ کنیز کو اطلاع کی تو وہ سکتے میں آ گئی۔ جس پر گزرتی ہے، وہی جانتا ہے۔ باقی تو صرف اور صرف باتیں کرتے ہیں۔ اچھی اچھی، نیک باتیں۔ مگر وہ صرف لفظ ہوتے ہیں۔ ان سے انسان کا پیٹ نہیں بھرتا۔ جس وقت کنیز بیوہ ہوئی، اسکی عمر سترہ برس تھی۔ والد کے گھر گئی تو وہاں بھی حالات کا جبر تھا۔ زیادہ دیر ٹھہر نہ پائی۔ اب کیا کیا جائے۔ دو معصوم بچوں کا ساتھ۔ جنہیں تین وقت تو نہیں، کم از کم ایک وقت کے کھانے کی تو ضرورت موجود تھی۔ کنیز نے میٹرک کر رکھا تھا۔ مگر میٹرک کے بعد کوئی نجی یا سرکاری نوکری میسر نہیں تھی۔ اس نے اپنے گاؤں کے نزدیک قصبے میں ایک گھر میں نوکری کر لی۔ جھاڑ پونچھ، کھانا بنانا۔ دو وقت کا کھانا مفت تھا۔ کچھ بچا کر اپنے بچوں کیلئے بھی کچھ سبب کر ہی لیتی تھی۔ یہ گھر، جہاں وہ نوکری کر رہی تھی۔ عجیب سا تھا۔ ایک پکی عمر کی عورت تھی جو گھر کی اصل مالکہ تھی۔ گھر میں کوئی مرد نہیں تھا۔ چار پانچ لڑکیاں تھیں۔ جنکی عمریں حد درجہ مختلف تھیں۔ کنیز کو عجیب سی بات محسوس ہوئی کہ گھر میں مختلف اوقات میں مرد آتے ہیں اور تھوڑی دیر کے بعد واپس چلے جاتے تھے۔ پکی عمر کی خاتون، جسے ''آنٹی'' کہا جاتا تھا۔ اس نے کنیز کو یہی بتایا کہ یہ مرد اسکے اور ان لڑکیوں کے رشتہ دار ہیں اور ملنے آتے رہتے ہیں۔ کنیز کو اپنی تنخواہ سے غرض تھی۔ لہذا اسے اس اَمر سے کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ گھر میں کون آ رہا ہے اور کون جا رہا ہے۔ اسے ہر ماہ چار ہزار روپے مشاہرہ ملتا تھا۔ جیسے تیسے، سانس اور جسم کا تعلق برقرار رکھ رہی تھی۔ بہرحال زندگی مشکل تھی

اور مزید ہوتی جارہی تھی۔ ہاں، ایک بات عرض کرتا چلوں۔ یہ کوئی کہانی نہیں سنا رہا۔ یہ دراصل بی بی سی چینل پر پاکستان پر بنی ہوئی ایک ڈاکومینٹری کا عکس ہے۔ سچی اور بنیادی حقیقت۔

آنٹی کا سلوک، کنیز سے بہت بہتر تھا۔ حد درجہ مذہبی سی تھی۔ مزاروں پر آنا جانا لگا رہتا تھا۔ ہاتھ بہت کھلا تھا محتاجوں اور غرباء کی مدد کرتی رہتی تھی۔ ایک دن کنیز سے پوچھا کہ تمہاری تنخواہ تو بہت کم ہے۔ یہ کچھ پیسے رکھ لو، تمہارا گزارا تھوڑا سا بہتر طریقے سے ہو جائیگا۔ آنٹی نے اسے تین ہزار روپے دے دیے۔ کنیز کیلئے یہ بہت بڑی رقم تھی۔ گھر واپس گئی۔ تو پہلی مرتبہ اپنے بچوں کو نئے کپڑے لیکر دیے۔ پلاسٹک کے کھلونے بھی خریدے۔ دونوں کو پلاسٹک کی چپلیں لیکر دیں۔ دس بارہ دن بعد، آنٹی نے کنیز کو کہا کہ وہ زیادہ پیسے کمانا چاہتی ہے یا نہیں۔ کنیز کے پاس تو صرف سوال تھے۔ ہر غریب کی طرح۔ کیا جواب دیتی۔ لازم ہے، اثبات میں ہی جواب تھا۔ آنٹی نے کمال مہارت سے کنیز کو ''دھندے'' پر لگا دیا۔ دنیا کا سب سے پرانا اور قدیم پیشہ۔ کنیز کی غربت نے اسے اس درجہ مجبور کر دیا کہ وہ بے بس تھی۔ اسکا بھی دل چاہتا تھا کہ دونوں بچے کسی اچھے درجہ کے سکول میں جائیں۔ اپنا معمولی سا مکان ہو۔ گھر میں قیمتی فرنیچر نہ سہی، کم از کم کرسیاں تو ہوں۔ گھر میں چارپائی تو ہو۔ یہ تلخ ترین بات ہے کہ تمام نیک اور اچھی باتیں، انسان کی بھوک کے سامنے ہار جاتیں ہیں۔ کنیز کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا۔ کنیز کے حالات بہتر ہوتے گئے۔ دولت تو خیر نہیں۔ مگر روز کے تین چار ہزار ملنے لگے۔ ایک عجیب سی بات۔ کنیز نے چونکہ میٹرک کر رکھا تھا۔ لہذا اسے اس نظام میں اعلیٰ تعلیم یافتہ سمجھا جاتا تھا۔ اسکی اہمیت روز بروز بڑھتی جارہی تھی۔ چار سال بعد کنیز نے وہ قصبہ چھوڑ دیا اور پنجاب کے ایک مرکزی ضلع میں اپنا نیا دھندہ زور و شور سے شروع کر دیا۔ کنیز آج تک زندہ ہے اور یہی کام کر رہی ہے۔ یعنی عصمت فروشی۔ بی بی سی کی رپورٹ کے مطابق کنیز کے ساتھ چھ سات لڑکیاں اور بھی رہتی ہیں۔ اور اب وہ ایک آنٹی بن چکی ہے۔ وہ زندہ تو ہے، مگر زندہ نہیں ہے۔ انسانوں کے جنگل میں بکی ہوئی روح ہے جو ہر وقت خریدار کا انتظار کرتی رہتی ہے۔ خوف کے اندھیرے میں سانس لے رہی ہے۔ مگر وہ مجبور ہے۔ کیونکہ اسکے پاس کوئی تعلیم، کوئی فن، کوئی ہنر نہیں ہے۔ کنیز آسمان کی طرف دیکھ کر یہی کہتی ہے کہ شائد اسکا مقدر ہی ایسا لکھا گیا تھا۔

ہمارے ملک میں تو خیر اس موضوع پر بات ہی نہیں کی جاتی بلکہ کی ہی نہیں جا سکتی۔ مگر یونیورسٹی آف مینی ٹوبا University of Manitoba نے پاکستان میں ان بدقسمت خواتین پر حد درجہ سنجیدہ تحقیق کی ہے۔ اس میں بنیادی محقق کا نام لورا ہیلری تھامسن ہے۔ لورا نے اس موضوع پر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہوئی ہے۔ تحقیق کے بقول، پاکستان میں عصمت فروشی کا کاروبار جاری و ساری ہے۔ قانونی طور پر ممنوع اس کام میں عملی طور پر کوئی رکاوٹ نہیں۔ لورا کے بقول، اس کاروبار میں لاکھوں خواتین ملوث ہیں۔ اس میں مرد حضرات بھی ہیں۔ جنکے فرائض دیگر نوعیت کے ہیں۔ درست تعداد کا علم تو کسی کو بھی نہیں ہے۔ مگر ایک محتاط اندازے کے مطابق یہ عدد دس لاکھ سے لیکر تیس پینتیس لاکھ تک ہو سکتا ہے۔ حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ اسکا باقاعدہ سروے کرنا انتہائی مشکل نہیں بلکہ تقریباً ناممکن ہے۔ پھر سماجی طور پر یہ اتنا بڑا سیاہ دھبہ ہے کہ کوئی انسان دن کی روشنی میں یہ تسلیم کرنے کیلیے تیار ہی نہیں کہ اسکا اس پیشے سے کوئی تعلق ہے۔ مگر ہر ذی شعور جانتا ہے کہ دنیا کا قدیم ترین پیشہ بہر حال ہمارے ملک میں بلا روک ٹوک جاری و ساری ہے۔

محترمہ سدرہ جبین نے اس موضوع پر کافی کام کیا ہے۔انکی تحقیق کے مطابق عصمت فروشی میں خواتین کی سب سے بڑی وجہ غربت ہے۔غربت پاکستان کے ہر قصبے،شہر،گاؤں،دیہات،محلّہ میں کسی نہ کسی طور پر موجود ہے۔بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ اس ملک میں شدید مفلسی سرِ بازار رقص کر رہی ہے تو بے محل اور بے جا نہ ہوگا۔بالکل اسی طرح سماجی اور معاشرتی ناانصافی بھی اسکی بنیادی وجوہات میں شامل ہیں۔ہمارے ملک میں عدالتی انصاف تو خیر نہ ہونے کے برابر ہے۔مگر معاشرتی بے انصافی بھی ہر طور پر عروج پر ہے۔ایسی ایسی تلخ کہانیاں ہیں کہ انسان کی روح لرز جاتی ہے۔بیروزگاری بھی اسکی ایک بڑی وجہ ہے۔اس ملک میں سرکاری اعداد وشمار کے مطابق روزگار نہ ہونے کی شرح چھ سے سات فیصد ہے۔مگر یہ تو آئی ایم ایف یا بورڈ آف سٹیٹکس Board of Statistics کے دیے ہوئے ہندسے ہیں۔شرح تو ہوسکتا ہے،دس سے بارہ فیصد ہو۔اگر آپ چھ فیصد کو بھی مان لیں تو ملک میں کروڑوں انسان کسی قسم کی کمائی نہیں کرتے۔ان میں اَن پڑھ انسانوں کی تعداد کم از کم ساٹھ فیصد ہے۔بہرحال یہ اعداد وشمار جو کچھ بھی ہوں،حقیقت یہ ہے کہ ہمارے ملک میں غربت،جہالت،بیروزگاری اور ناانصافی کی ایک دلدل ہے۔جس میں اکثریت دھنسی ہوئی ہے اور صرف سانس لے رہی ہے۔سانس بھی کیوں لیتے ہیں،اسکی وجہ کم از کم مجھے معلوم نہیں۔بہرحال متعدد وجوہات کی بدولت کئی خواتین اس دھندے میں ملوث ہوجاتی ہیں۔مجبوری دنیا کا سب سے بڑا غم ہے اور مجبوری سے فائدہ اُٹھانے والے بھیڑیے ہر جگہ تاک لگائے بیٹھے ہیں۔لوگوں کا گوشت نوچنے والوں کی یہاں کوئی کمی نہیں ہے۔بلکہ فراوانی ہی فراوانی ہے۔اکثریت،دوسروں کی مجبوری کا ہر طریقے سے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔اس دلدل میں پھنسنے والی مجبور خواتین،کسی نہ کسی جگہ اپنی ضرورتوں کے تحت تھک کر ہار جاتی ہیں۔

ہمارے منافق معاشرے میں تلخ حقیقتوں کو تسلیم کرنا اَز حد مشکل ہے۔شائد ناممکن۔ہمارے اندر اتنی اخلاقی قوت ہی نہیں کہ ہم اپنے سماج کے ایک حصے کا سرِ عام ذکر کرسکیں۔اسے گناہ،عذاب،عفریب اور پتہ نہیں کیا کیا نام دیکر خاموش ہوجاتے ہیں۔جیسے برا نام دینے سے وہ معاملہ ختم ہوگیا۔مگر صاحبان! معاملہ تو ایک لمحے کیلئے بھی ختم نہیں ہوا اور نہ ہوگا۔دینی علماء میں مولانا طارق جمیل صاحب نے اس نازک ترین موضوع کو لوگوں کے سامنے اُٹھایا ہے جو قابل ستائش بات ہے۔اگر حکومتی سطح پر دیکھا جائے تو وہاں تو مکمل سکوت ہے۔کیونکہ کوئی تسلیم ہی نہیں کرتا کہ یہ سماجی داغ موجود ہے۔جب تسلیم ہی نہیں کیا جاتا،تو پھر ان بدقسمت ترین خواتین کے حقوق کی بات کیا کرنی۔ان فروخت ہونے والے جسموں پر کیا بیتتی ہے،اس پر کہیں بھی بات کرنا غیر معزز ہے۔ان بکی ہوئی روحوں کے اندر کتنے غم،دکھ،درد اور تکلیف رواں ہے۔اس پر ہمارے جیسے منافق درمنافق معاشرے میں کیا بحث کرنی۔یہاں تو صرف فرشتے رہتے ہیں۔پاک فرشتے۔انکا بھلا گناہ سے کیا تعلق؟

راؤ منظر حیات